

فراق کی نظموں میں دھرتی

شمانلہ مہرین

ABSTRACT:

Urdu poetry was well know in Ghazal. From the beginning Mir Taqi Mir, Mirza Rafi Saudaa, Mirza Ghalib, Zaoq, Momin and Nasikh like poets contributed a lot towards Urdu Ghazal. After the modern poetry movement stated by Haali and Azad, Urdu Nazam was owned by Iqbal, Faiz and Josh which flourished in few decades then N.M. Rashid , Mira G, Akhtar Sherani etc kept the Nazam's flag high. Firaq Gorakhpur is prominent in Ghazal but he also put poetic potential in Nazam. Nazam has broader prospect then Ghazal in terms of Issue, problems and topics to elaborate. Firaq used his expertise to portray the great civilization. He prays the beauty of his land and its heroes. He loves his homeland which actually is the mother of the people. In this article I tried to explore than aspect of Firaq's poetry.

اردو شاعری عام طور پر فارسی کی مقلد سمجھی جاتی ہے۔ غزل کی حد تک شاید یہ خیال درست بھی ہو کہ کلاسیک دور کے زیادہ تر شعراء بنیادی طور پر فارسی زبان میں شعر کہتے تھے۔ یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ولی دکنی کے شعروں کی دلکشی اور ہر دلغیزی کو دیکھ کر اساتذہ نے اس طرف توجہ مبذول کی۔ ریختہ میں شعر گوئی ثقہ شعرا نے شروع کر دی مگر غزل کی روایت میں انہیں فقط فارسی رنگ ہی بھایا۔ اس روایت سے سر مو انحراف بھی شعری شریعت میں کفر ٹھہرا۔ بقول حسن عسکری شاعر کی ذاتی پسند یا ذاتی تاثرات کو بہت ہی کم دخل ہے۔ (۱)

حتی کہ فطرت کا دخل بھی مخص علامتی حد تک ہے۔ اسی بنیاد پر یہ کہنا حق بجانب بنتا ہے کہ غزل کی جڑیں ہندوستانی سرزمین میں پیوست نہیں ہیں اور شاید غزل کا مطمع نظر آفاقی ہے لہذا جغرافیہ اس کے قافیے میں نہیں سما سکتا۔ اردو نظم کا ناطہ اسی لیے مقامی بولیوں کے گیتوں اور دوہوں سے جوڑا جاتا ہے کہ یہ اس دھرتی کی پیداوار ہیں۔

نظم کا دامن بھی چونکہ غزل سے زیادہ وسیع ہے لہذا اس میں متنوع مضامین آسانی سے کہپائے جا سکتے ہیں۔ فطرت کی بو قلمونیوں کو دنیا کی ہر زبان میں نظم کیا گیا اور انگریزی میں ورڈ زور تھ نے تو گویا اس کو اوج کمال تک پہنچا دیا جس نے بجا طور پر اردو شاعری پر اپنا اثر ڈالا۔ قدرتی مناظر شاعر جب بیان کرتا ہے تو اس کے سامنے کوئی مخصوص خطہ زمین ہوتا ہے مثلاً ورڈز ورتھ نے لیک ڈسٹرکٹ کے حسین مناظر بیان کئے۔ گویا نظموں میں دھرتی کے تہذیبی مظاہر نمایاں ہوئے۔

اردو شاعری میں انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے جب جدید نظم کے احیاء کا ڈول ڈالا گیا تو وہ انیسویں صدی کا ربع آخر تھا۔ جس زمانے میں لاہور میں حالی و آزاد یہ تحریک چلا رہے تھے اسی

زمانے میں سیالکوٹ میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام اقبال تھا اور جس نے بیسیویں صدی کے آغاز ہی میں (ہمالہ لکھ کر) دونوں بزرگوں کے خواب کو حقیقت کا رنگ دے دیا۔ اقبال نے انگریزی شاعری سے اسی طرح کسب فیض کیا جس طرح فارسی سے کیاچنانچہ ان کے ہاں ابتداء میں فطرت نگاری دراصل قومی و تہذیبی شعور کی آئینہ دار ہے۔ ترانہ بندی سمیت بے شمار نظمیں قدیم تہذیبی نظریے کے موافق لکھی گئیں۔

ترقی پسند تحریک اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے جہاننثر میں انقلابی تبدیلیاں کیں وہیں نظم میں بھی نئے نئے تجربات کیے۔ فیض، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، ندیم قاسمی وغیرہ کتنے ہی نام ہیں جو دھرتی سے جڑی ہر شے کو شعری قالب عطا کرتے رہے۔ ترقی پسند عہد میں اس تحریک سے لاتعلق رہنے والے شعراء بھی اس کے اثر سے کلی طور پر بچ نہ سکے۔ مثلاً جوش، وزیر آغا، مجید امجد وغیرہ۔ فراق گور گھپوری کی شاعری بھی اپنے زمانے سے ہم آہنگ ہے۔ ان کی نظموں کی طوالت اور اشعار کی بھر مار کئی جگہ طبیعت کو گراں گزرتی ہے مگر جس قسم کے حالات وطن کو درپیش تھے ان میں سرزمین سے محبت کا تقاضا تھا کہ لوگوں کے اندر اپنی تہذیب کی وقعت اجاگر کی جائے۔ وطنیت کے جذبے سے سرشار ہو کر وہ ہم وطنوں کو پیغام دے رہے ہیں کہ تقلید مغرب سے بچو اور یاد رکھو۔

اسی ارض پاک سے اٹھیں بہت سی تہذیبیں

طلوع ہوئیں اور یہیں غروب ہوئیں

اسی زمین سے ابھرے کئی علوم و فنون

فراز کوہ ہمالیہ، یہ ردو گنگ و جمن

اور ان کی گود میں پروردہ کاروانوں نے

یہیں رموز خرام سکوں نما سیکھے

نسیم صبح تمدن نے بھیرویں چھیڑیں

یہیں وطن کے ترانوں سے بھی پوئیں پھوٹیں (۲)

کوئی قوم یا معاشرہ جب فقط عقل کی پیروی کا غلام بن جاتا ہے تو گویا اس کا رشتہ عشق سے منقطع ہو جاتا ہے۔ نو آبادیاتی سوچ نے احساس کی اعلیٰ قدر یعنی پاکیزگی کو چھین لیا تھا۔ نفسا نفسی کا عالم بپا تھا ہر شخص مشینوں کے زیر اثر جی رہا تھا۔ ہندوستانی روح کا متلاشی شاعر اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ حالات کی آندھیاں بہت زور دار ہیں۔ تقدیر بھی موافق نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنی قوم کو ہمت و جوانمردی کا سبق دے رہا تھا۔

انسان ہے اور چار طرف وادی پر خار

پر ہول مناظر کا وہ ماحول شرر بار

وہ بولتے سناتے وہ زندان شب تار

کمزور ہیں پر جبر مشیت سے لڑیں گے

ہم زندہ تھے اور زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے

جبر مشیت سے بھڑ جانے کا درس کوئی دیوانہ ہی دے سکتا ہے۔ وہ عشق کو تخلیقی قوت مانتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ اقبال کے مقلد دکھائی دیتے ہیں۔

جس سے میرے وجدان میں پلتے ہیں خیالات۔ جمہور میں وہ ناز و نعم بانٹ رہا ہوں
تعمیر کریں گے نئی دنیا نئی دنیا۔

کمزوروں میں زور ہمہ بانٹ رہا ہوں

فراق نے فکر و شعور میں ہی نہیں بلکہ زبان و بیان میں بھی دھرتی کو ترجیح دی ہے۔ زمین سے رشتہ استوار اس وقت تک رہتا ہے جب تک آپ کی جڑیں اس کے اندر موجود ہوں۔ انہوں نے اس کا خاص التزام رکھا کہ تحریر خود اپنی تہذیب کی نمائندہ نظر آئے۔ فراق نے زبان کے سلسلے میں خالص ہندوستانی الفاظ کو بھی برتا، متروکات کو رائج کرنے کی کوشش بھی کی۔ عوامی محاوروں کو بھی استعمال میں لائے، عوامی لہجوں کو بھی کھنگالا۔ (۳)

سامراج اور ان کے گماشتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

پورا ڈھونگ رچا رکھا تھا

کیا اندھیر مچا رکھا تھا

ودیا کو دفنا رکھا تھا

اس کا روپ چھپا رکھا تھا

دن کو رات بنا رکھا تھا

شب دوں کا اڈمیر رچا کر

من گھڑنت سے ایک بات کا

سو بستار بنا رکھا تھا

ایک بیوی پار جما رکھا تھا

کاروبار چلا رکھا تھا

(شکشا میں گول مول)

عام طور پر سیاسی اور سماجی موضوعات کو جب نظم کیا جاتا ہے ایسے مینفنی لوازمات پورے نہیں ہوتے اور اشعار میں سطحیت در آتی ہے۔ فراق کے ساتھ بھی ایسا ہوا مگر جذبے کی سچائی اور مفلوک الحال طبقوں کی محبت نے نظموں کی مقبولیت میں کمی نہ آنے دی۔ کالونیلزم نے تقسیم کرو اور حکومت کرو والی پالیسی کو لاگو کر کے مقامی طاقت پر کاری ضرب لگائی۔ ان کا خیال تھا کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں لہذا ان کو گروہوں اور خانوں میں بانٹا جائے چنانچہ انہوں نے ہندو مسلم قیادت کو الگ کر کے اپنی حکمت علمی کو کامیاب بنایا۔ فراق کو یہ احساس تھا کہ عام آدمی بے قصور مارا جا رہا ہے۔ نئی ایجادات اور ٹیکنالوجی کے نام پر لوگوں سے ان کی شناخت چھینی جا رہی ہے۔ ان کی درد مندی کی مثال ان کی نظم ”جو انٹ اسٹاک کمپنی“ کے چند اشعار میں صاف جھلکتی ہے :-

سسکیاں بھرتے آدمی کی قسم

درد کی ماری زندگی کی قسم
 اک جہنم ہے جس بھری دھرتی
 جوائنٹ اسٹاک کمپنی کی قسم
 کرتی ہے سائیں سائیں ہر بستی
 ہے یہ تہذیب یاز بردستی
 کمپنی راج کا کرشمہ دیکھ
 چیزیں مہنگی ہیں زندگی سستی

(جوائنٹ اسٹاک کمپنی)

فراق کو احساس تھا کہ مشرقی تہذیب جو زرعی نظام سے وابستہ تھی اور جس کے لوگ مادیت سے کوسوں دور تھے۔ ان کی حیات سکون و اطمینان سے گزر رہی تھی۔ بمشکل گزارہ کرنے والے مذہبی عبادت گاہوں کے لیے بخوشی چندہ اور نذرانہ دے دیا کرتے تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ یہ عارضی زندگی ہے اصل اور ہمیشگی کی دنیا کوئی اور ہے۔ مغربی نظام نے عام شہری سے یہ سرمایہ قناعت چھین لیا اور اسے مادیت کا سبق دے کر نفرتوں کی بھینٹ چڑھا دیا فنکار جس معاشرے کا فرد ہوتا ہے اس سے لا تعلق نہیں رہ سکتا۔ ادب کے لیے ممکن نہیں کہ وہ زندگانی کے مسائل سے منہ موڑ لے شمیم حنفی نے لکھا ہے۔

”وہ دنیا جس سے ادب کا تعلق ہے ایک ایسی دنیا ہے جہاں انسان جنم لیتے ہیں۔ زندہ رہتے ہیں اور بالآخر مر جاتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جس سے وہ پیار بھی کرتے ہیں اور نفرت بھی۔ جس میں فتح و ذلت اور امید و مایوسی دونوں کا تجربہ کرتے ہیں۔ صعوبتوں اور مسرتوں دیوانگی اور فراست، حماقت اور عیاری اور دانش کی دنیا۔“ (۴)

فراق صاحب تاریخ کے ارتقاء سے واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ دھرتی پر ظلم کا بھلے راج ہو مگر اس کی اصلی زینت اور سنگھار محنت کش اور مزدور طبقہ ہوتے ہیں جس کے دم قدم سے معاشرہ زیست کرتا ہے :-

توڑا دھرتی کا سناٹا کس نے؟ ہم مزدوروں نے
 ڈنکا بجا دیا آدم کاکس نے؟ ہم مزدوروں نے
 اوٹ میں چھپی ہوئی تہذیبوں کا گھونگھٹ سرکایا کس نے؟
 شرمیلی تقدیر کی دیوی کا آنچل ڈھلکایا کس نے؟
 دنیا کی اندھی نگری میں جگ جگ دیپ جلا یا کس سے؟
 جگ میں رنگ رنگ چما چم یہ بازار سجایا کس نے؟

(مزدوروں، کاریگروں، شیلی کاروں کی للکار)

یہاں شاعر ہمیں بلندی خیال اور اخلاقی ترفع کی اعلیٰ منزلوں پر متمکن دکھائی دیتا ہے۔ الفاظ اور بندش کی سادگی کے باوجود ہمہ گیریت اور گہرائی موجود ہے۔ زندگی کی معنویت کے نقوش ان کاریگروں کے رہن منت ہیں۔ مندرجہ بالا چند اشعار میں ہندوستانی کلچر پورے طمطراق سے اپنا ثبات

کر رہا ہے۔ جن وجوہات کی وجہ سے تہذیب مشرق زوال پذیر ہوئی ان میں ایک استحصالی نظام تھا جو سرمایہ دارانہ سوچ کا آئینہ دار تھا۔ اس سوچ نے اقلیت کو ہمنوا بنا کر ان کو فائدہ پہنچایا۔ جس سے سیٹھ، مہاجن، ساہوکار، دلال اور افسر وغیرہ نے ترقیاں کیں۔ اور نئی تہذیب کی داغدار روشنی سے گھر روشن کئے۔ دھرتی کے سچے سپوت وہ لوگ تھے جو اکثریت میں ہونے کے باوجود کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے علاقیت لسانیت قومیت اور فرقہ واریت کے مباحث سے معاشرے میں ضعف پیدا ہوا اس عظیم تہذیب کی وحدت کو تقسیم کرنے میں استعماری طاقتوں نے اقلیت کو ہیرو بنایا مگر فراق جیسے فنکاروں نے ان جعلی اور نقلی مشاہیر کے چہروں سے نقاب نوچے اور آنے والی نسلوں کو بتایا کہ حقیقی وارث اس زمین کے کون ہیں۔ شاعری قوی جذبات کا ایک اضطراری سیلان ہے۔ اس کا سرچشمہ ماضی کے وہ جذبات ہوتے ہیں جنہیں سکون کے لمحوں میں یاد کیا جائے۔ (۵)

اس سلسلے میں ان کی نظم ”ہنڈولہ“ ایک ایسا شاہکار ہے جو نہ صرف اردو ادب کا سرمایہ ہے بلکہ اس نظم کے ذریعے ہندوستانی تہذیب اپنا چہرہ دکھاتی نظر آتی ہے۔ اس میں فراق نے زور خطابت اور قادر الکلامی کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ تہذیب مشرق کی عظمت رفتہ، دھرتی کے رنگ جہاں نمایاں ہوتے ہیں وہیں اس ابتلا کا ذکر بھی ہے جس سے ہماری روایت کو دو چار ہونا پڑا۔

دیار بند تھا گہوارہ۔۔۔ یاد ہے ہمد
بہت زمانہ ہوا کس کے بچپن کا
اسی زمین کھیلا ہے رام کا بچپن
اسی زمین پہ ان ننھے ننھے ہاتھوں نے
کسی سمے دھنش بان کو سنبھالا تھا
اسی دیار نے دیکھی ہے کرشن کی لیلیا
یہیں گھروندوں میں سینا، سلوچنا، رادھا
کسی زمانے میں گڑیوں سے کھیلتی ہوں گی

(ہنڈولہ)

ہندوستانی تہذیبی روایت میں دوسری چیزوں کے علاوہ ایک چیز کہانی بھی ہے جس نے اس سرزمین کو مہذب بنانے میں مدد دی۔ جاتک کتھاؤں سے مہا بھارت تک اور ویدوں سے پرانوں تک داستانوں کا ایک سلسلہ ہے جو یہاں کی سرزمین کا سرمایہ افتخار ہے اردو شاعری کو یہ اعزاز بھی رہا کہ اولین دور میں داستانیں منظوم بھی لکھی گئیں۔ فراق نے کھلے دل سے فطرت کی نمائندہ یعنی کہانی سے استفادہ کرنے کا اعتراف کیا ہے اور اس بات کا اعلان بھی کہ بھلا جو سرمایہ داستانوں کا ہمارے پاس ہے وہ کسی اور کی بھی ملکیت ہے؟۔

میں پوچھتا ہوں کہ گہوارے اور قوموں سے
بسے ہوئے کہیں ایسی داستانوں سے
کہانیاں جو میں سنتا تھا اپنے بچپن میں

مرے لیے وہ نہ تھیں محض باعث تفریح
فسانوں سے مرے بچپن نے سوچنا سیکھا
فسانوں سے مجھے زندگی کے درس ملے

(ہنڈولہ)

جس دور میں فراق شاعری کر رہے تھے وہ عام طور پر نظم کا دور سمجھا جاتا ہے اور جدید نظم والی تحریک ایک طرح سے غزل کے لیے خطرہ بن گئی تھی۔ اس نازک دور میں جن گنتی کے شاعروں نے غزل کی روایت کو زندہ رکھا ان میں جگر مراد آبادی، حسرت موہانی، شاد عظیم آبادی، اصغر گونڈوی اور فراق گورکھپوری شامل ہیں۔ تہذیب مختلف عناصر کا مجموعہ ہوتی ہے جن میں فنون لطیفہ بھی شامل ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ نو آبادیاتی طاقت نے ہر اس عنصر پر وار کیا جو تہذیب کا ستون تھا جس پر دھرتی کو ناز تھا۔ اسی واسطے اردو غزل ہو کہ اردو زبان جب بھی ان پر کڑا وقت آیا فراق خم ٹھونک کر ان کے دفاع پر کمر بستہ ہو گئے۔ آل احمد سرور کا قول۔ مطرب نظامی نے نقل کیا ہے۔

”ہم جب اقبال، جوش، فیض اور فراق کا نام لیتے ہیں تو گویا اقدار کی اہمیت کی روایت اور تسلسل کو یاد کرتے ہیں جو مشترکہ تہذیب انسان دوستی اور زندگی کے موڑ پر رہنمائی سے عبارت ہے اور اسی روایت کے ایک درشہور فراق بھی تھے“ (۶)

مشترکہ تہذیب ہی وہ امرت دھارا تھی جو انسانی اعلیٰ اقدار کی ضامن تھی۔ اسی وصف کی بدولت یہ سرزمین امن کا گہوارہ تھی۔ جب یورپ کی اقوام آپس میں دست و گریباں تھیں جب عرب ابھی وحشی تھے جب منگول و تاتار ننگ انسانیت تھے۔ جب امریکہ میں خانہ جنگیاں تھیں اور انسان جانوروں کی طرح خرید و بیچا جاتا تھا تب ہندوستان ایک مہذب ملک تھا جہاں مختلف مذاہب اور رنگ و نسل کے لوگ مساوات کے اصولوں پر زندگی گزار رہے تھے۔ یہیں علم و ہنر کے وہ موتی رولے جا رہے تھے جو کائنات کے سر بستہ رازوں کے متعلق تھے۔ پھر تاریخ کا پہیہ گھوما اور مختلف جنگجو اس ملک پر حملہ آور ہوئے۔ ان حملہ آوروں میں آخری ضرب اس قوم نے لگائی جو اپنے آپ کو مہذب کہلاتی تھی۔ انگریز نے دھرتی میں نفرت کے بیج بوئے جو چند دہائیوں میں تناور درخت بن گئے۔ ایسا نظام متعارف کروایا جس میں محنت کش کمی کمین کہلانے لگے اور حکومت کے ایجنٹ اور غدار عزت دار بن بیٹھے۔ اس صورت حال پر دردمند فنکار کڑھتے تھے اور ان سہانے سپنوں کو یاد کرتے تھے جب ملک پر حقیقی لوگوں کا حق تسلیم کر لیا جائے گا۔

ہندو راج سے بڑھ کر ہو گا
بودھ راج سے بڑھ کر ہو گا
مسلم راج سے بڑھ کر ہو گا
محنت کرنے والوں کا راج

(دھرتی کی کروٹ)

یہی وہ احساس ہے جو مشترکہ تہذیبی روایت کی اساس تھا۔ یہ اساس مساوات اور اخوت کے اصولوں پر مبنی تھی کیونکہ تہذیب کے درجے تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ قوم میں ہر شخص کو یکساں آزادی حاصل ہو اور عام خوشی اور خوشحالی میں بھی اسے حصہ دیا جائے۔ (۷)

جہاں استحصال ہو، ظلم ہو وہاں حق اور عدل پنپ نہیں سکتے۔ فراق کی نظموں میں ہمیں مظلوموں کی آہیں سنائی دیتی ہیں اور ظلم سے نفرت کا پتہ چلتا ہے۔ دھرتی کے مختلف مظاہر میں مناظر فطرت بھی شامل ہیں ان کی نظموں کا پس منظر ہندوستان کی زمین ہے۔ وہ ان سے محبت و انس ایسے کرتے ہیں جیسے گوشت پوست کے محبوب سے کیا جاتا ہے:

یہ شام اک آئینہ نیلگوں، پر نم، یہ مہک
یہ منظروں کی جھلک، کھیت، باغ، دریا، گاؤں
یہ کچھ سلگتے ہوئے، کچھ سلگنے والے الاؤ
سپاہیوں کا دبے پاؤں آسمان سے نزول۔
لٹوں کو کھول دے جس طرح شام کی دیوی
پرانے وقت کے برگد کی یہ ادا س جٹائیں
یہ کائنات کا ٹھہراؤ، یہ اتھا سکوت
قریب و دور یہ گو دھول کی ابھرتی گھٹائیں
یہ نیم تیرہ فضا روز گرم کا تابوت
پرانے وقت کے برگد کی یہ اداس جٹائیں

(پرچھائیاں)

فراق دھرتی کے مشاہیر کی تکریم کرتے ہیں تو ہندوستان کے فردوسی معلوم ہوتے ہیں۔ اردو شاعری میں اقبال کے بعد فراق ہی ہیں جنہوں نے بلا تفریق مقامی بیروز کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ رام، بھرت، بھرتی ہری، کپل و یاس، والمیک، وشوامتر، گوتم، کالیداس، کبیر، میرا باٹی، اشوک نانک، فرید، چشتی، تان سین، اکبر، خسرو سمیت کتنے ہی نابغے شامل ہیں۔ فراق نے یہ لسٹ بیسیویں صدی کے تہذیبی فرزندوں تک بڑھا کر نئی نسل کو روایت سے جڑے رہنے کا درس دیا ہے۔

”اسی زمین کے لال میر و و غالب بھی۔“

ٹھمک ٹھمک کے چلے تھے گھروں کے آنگن میں
انیس و حالی و اقبال اور وارث شاہ۔ یہیں کی خاک سے ابھرے تھے
یہیں سے اٹھے تھے تہذیب ہند کے معمار

(ہندولہ)

عام طور پر ان کی عشقیہ شاعری بھی جس میں احساس تنہائی اور نا آسودگی اور مایوسی کی جھلک ہوتی اس میں بھی دھرتی کا کرب کروٹیں لیتا محسوس ہوتا ہے۔ غم جاننا بھی دراصل غم دوراں کا پرچار ک بن جاتا ہے۔

فراق کی فکر اس سرزمین کی روایت سے اپنی جڑیں جوڑتی ہے۔ ان کے شعر یہاں کے دریا، کہسار، میدان، وادیوں اور موسموں کو آرٹسٹ کے برش کی طرح کا غز پر نقش کرتے ہیں۔ وہ اگرچہ مارکسی نظریہ یا سوشلسٹ انقلاب سے متاثر ہوئے۔ مگر کلی طور پر ان سے وابستہ نہیں ہوئے۔ معاشی مساوات اور محنت ان کا مطمع نظر تھا۔ اپنے مفلوک الحال لوگوں کی تقدیر بدلی جا سکتی ہے۔ یہ وہ روحانیت ہے جو مادیت کے فلسفے کے الٹ ہے۔ انفرادی سوچ اگر اجتماعی مفاد کے لیے کام رہی ہو تو اس سے معاشرہ مستحکم ہوتا ہے۔ رواداری کا فروغ ممکن ہوتا ہے۔ فرد اکیلا اپنا وجود سہارے کے قابل نہیں ہے۔ وہ قدم قدم پر دوسروں کا محتاج ہے۔ نئی تہذیب ذاتی مفاد اور لالچ پر مبنی فکر کو آگے بڑھا رہی تھی۔ اس سے شاید ذاتی فائدے تو ضرور حاصل کیے جا رہے تھے مگر اس سے وحدت کو شدید خطرہ لاحق تھا۔

فراق کو اس کا اندازہ تھا۔ اس لیے وہ بھولے ہوئے سبق یاد کرواتے ہیں جن کے مطابق دھرتی کو اولیت حاصل ہے:

دھرتی کو سنوارا تو سنورتے گئے خود بھی
فصلوں کو ابھارا تو ابھرتے گئے خود بھی
فطرت کو نکھارا تو نکھرتے گئے خود بھی
نت اپنے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھلیں گے
ہم زندہ تھے، ہم زندہ ہیں، ہم زندہ رہیں گے

(داستان آدم)

فنکاروں کے ادب پارے بھی تہذیبوں کے جزو ہوتے ہیں جو دوسری کئی اکائیوں سے مل کر کل کو متشکل کرتے ہیں۔ پھر ایک ایسا مقام آتا ہے کہ جہاں ادیبوں کی آواز مہذب لوگوں کا مافی الضمیر بن جاتی ہے۔ فراق نے احمد ندیم قاسمی کی کتاب دشتِ وفا کے پیش لفظ میں ان کے بارے میں لکھا تھا:

”ان (قاسمی) کی آواز نے تہذیب و تربیت یافتہ قلوب میں گھر بنا لیا ہے اور اگر ایسے قلوب بھی ہیں جن ابھی ندیم کی آواز نے گھر نہیں بنایا تو اسے ان قلوب میں گھر بنا لینا چاہیے“ (۸)

یہ بات خود فراق کی ذات پر بھی صادق آتی ہے۔ مہذب اور کلچرڈ انسان کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ دھرتی سے محبت کرے۔ اپنی پیوستگی اپنی زمین کے ساتھ مضبوط رکھے۔ ان کی نظموں میں وطن کی مٹی کے ساتھ عقیدت کی خوشبو موجود ہے۔ ان کی پہچان غزل ہے جس میں حزن و ملال کا رنگ نمایاں ہے جس میں شعور کو جگانے کی کوشش واضح نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس وہ نظم میں سرخوشی و نشاط کا پہلو اجاگر کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اسلوب و فنی مباحث سے قطع نظر ان کے لہجے میں روایت کی گونج موجود ہے۔

وہ روایت جو مشترکہ ورثہ تھی۔ فراق تمام تر تعصبات سے دامن بچا کر فقط انسان اور انسانیت کی بات کرتے ہیں:

صحرا کو جو چمن بنادیں

ایسے دیوانے کم ہوں گے
آنکھ اٹھا کر حد نظر تک
دیکھو گے تو ہمیں ہم ہوں گے

(مزدوروں، کاریگریوں، شیلی کاروں کی للکار)

حوالہ جات:

- ۱) شمیم حنفی، فراق شاعر اور شخص، لاہور: بک ٹریڈرز، 1983ء، ص 63
- ۲) فراق گورکھپوری، مرتب مطرب نظامی۔ ص۔ کلیات فراق گورکھپوری، جہلم: بک کارنر، 2014ء، ص 43
- ۳) نوازش علی ڈاکٹر، فراق گورکھپوری، شخصیت اور فن، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2011ء، ص 325
- ۴) شمیم حنفی، جدیدیت اور نئی شاعری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2008ء، ص 216
- ۵) محمد ہادی حسین (مرتب)، مغربی شعریات، لاہور: مجلس ترقی ادب، 1968ء، ص 56
- ۶) فراق گورکھپوری، مرتب مطرب نظامی۔ ص۔ کلیات فراق گورکھپوری، جہلم: بک کارنر، 2014ء، ص 28
- ۷) حمید اللہ خان پروفیسر، تعلیم و تہذیب، لاہور: مجلس ترقی ادب، 1975ء، ص 33
- ۸) احمد ندیم قاسمی، ”پیش لفظ“، فراق گورکھپوری، دشت وفا، لاہور: التحریر، 1992ء، ص 17
- /...../